تاریخ الفقہ

تاریخ فقہ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ

﴿دوسری قسط﴾

﴿علامہ محمد ابوزہرہ مصری﴾

(ترجمہ: معراج محمد بارق)

ائمۂ فقہ :

اسلامی تاریخ میں فقہ کے ائمہ یا ائمۃ المذاہب اِس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ فقہ اسلامی کے شارح ہیں، اور اس کا متن کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہؓ ہیں۔ یہی تینوں چیزیں نورِ اسلام کی شاہد، رسالت کا مظہر اور شریعت محمدیہ ﷺ کا مینار ہیں۔

اِن ائمہ کرام نے اپنی آراء کو ماننا اُمت مسلمہ یا اپنے بعد آنے والی نسلوں پر فرض قرار نہیں دیا۔ بلکہ ان آراء کو اس طرح ان کے آگے پیش کیا کہ جو کچھ نصوصِ (کتاب و سنت) میں واضح طور پر موجود ہے تو اس کا حکم وہی ہے، اُس میں کوئی تغیر اور تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ اِس پر ان سب کا اجماع ہے۔ البتہ اگر کسی نص کے سمجھنے اور اس کی تعبیر و تفسیر میں اختلاف کی گنجائش ہو تو وہ الگ بات ہے۔

اور جو کسی فقیہ کی رائے ہو تو وہ رائے ہی رہے گی اور وہ اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ جو بہت زیادہ رائے استعمال فرماتے ہیں اور جنہوں نے قیاس و رائے کے ذریعے بہت سے مسائل اور ان کے احکام کا استنباط کیا ہے،

فرماتے تھے:

هٰذَا اَحْسَنُ مَا وَصَلْنَا اِلَيْهِ فَمَنْ رَاٰى خَيراً مِنْهُ فَلْيَاْ خُذْبِهٖ۔

یہ بہتر سے بہتر (استنباط) ہے جس تک ہم پہنچے ہیں۔ اگر کسی کو اس سے بہتر (کوئی حل یا حکم) نظر آئے تو وہ اس پر عمل کرے۔

ایک مرتبہ آپؒ کے مستنبط کئے ہوئے فقہی مسئلہ کے بارے میں کسی نے آپ سے پوچھا:

اَهٰذَا هُوَالْحَقُّ الَّذِىْ لَا شَكَّ فِيْهِ ؟

کیا یہ ایسا حق ہے جس میں کوئی شک نہیں؟

آپؒ نے جواب دیا:

لَا اَدرِىْ لَعلَّهُ الْبَا طِلُ الَّذِىْ لَا شَكَّ فِيْهِ۔

مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے یہ وہ باطل ہو جس کے باطل ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

الغرض ان تمام ائمہ کا حال اپنی رائے اور استنباط کے بارے میں وہی تھا جو بعد کے فقہاء نے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے اور یہی جملہ ان سب کے زبان زد تھا۔

رَأْ يُنَا صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخطأَ و رَأْىُ غَيْرِ نَاخَطَاً يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ۔

ہماری رائے درست ہے، البتہ اس میں غلطی کا امکان ہے، اور دوسرے فقہاء کی رائے (ہماری نظر میں) غلط ہے، البتہ اس کے درست ہونے کا امکان ہے۔

ان ائمہ فقہ میں سے بعض حضرات کے مذاہب تو تاریخ کے غار میں گم ہو کر رہ گئے اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ مثلاً امام اوزاعیؒ فقیہِ شام جو امام ابو حنیفہؒ کے ہمعصر تھے۔ اور امام ابن شبرمہؒ فقیہِ بصرہ جو وہاں کے قاضی بھی تھے۔ اور قاضی ابن ابی لیلیٰؒ فقیہِ

کوفہ، اور امام لیث بن سعدؒ فقیہِ مصر جن کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ:

''وہ امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ تھے لیکن ان کے شاگردوں نے ان (کی فقہ) کو قائم و محفوظ نہ رکھا۔''

ان کے علاوہ اور بہت سے ائمہ فقہ گزرے ہیں جن کا مذہب مدوّن شکل میں یکجا نہیں ملتا، البتہ ان کے بہت سے اقوال و فتاویٰ دیگر مذاہب کی فقہی کتابوں میں درج ملتے ہیں، خصوصاً فقہائے احناف کی کتابوں میں مثلاً قاضی ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو حنیفہؒ کے درمیان فقہی اختلاف جس کو امام ابو یوسفؒ تلمیذِ امام ابو حنیفہؒ نے یکجا کر کے لکھا۔(۱) یا ان کی دوسری کتاب ''الرد علیٰ سیر الاوزاعیؒ'' جس میں انہوں نے امام اوزاعیؒ کی ''سیر'' (بین الاقوامی قانون) سے متعلق آراء و فتاویٰ کا رد لکھا (اور اس ضمن میں امام اوزاعیؒ کے اقوال بیان کئے) ان ائمہ کرام کی بہت سی فقہی آراء آپ کو ایسی کتابوں میں بھی بکھری ہوئی ملیں گی جن میں مختلف مذاہب کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے مثلاً ابن قدامہؒ کی ''کتاب المغنی'' ابن حزمؒ کی ''المحلی'' ابن رشدؒ کی ''بدایۃ المجتہد'' امام نوویؒ کی ''المجموع'' اور امام سرخسیؒ کی ''المبسوط''۔

انہی ائمہ میں سے جن کے مذاہب تاریخ کے اوراق میں گم ہو کر رہ گئے، ایک امام لیث بن سعدؒ ہیں جن کا ایک اہم مکتوب آج بھی بعض کتابوں میں محفوظ ہے(۲) اس خط میں ان کے اور امام مالکؒ کے مابین بعض فقہی مسائل پر جواب سوال اور علمی مذکرہ ہے۔ اس خط سے امام لیثؒ کے تفقہ و دانشمندی اور علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، اس خط میں اگرچہ فقہی اختلافات پر گفتگو کی گئی ہے لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط ایک مخلص قلبِ مؤمن کی آواز ہے جو (اختلاف کے باوجود) امام مالکؒ سے محبت رکھتا ہے اور ان کی مودّت سے سرشار ہے۔ اس خط کا پورا علمی اور فقہی مباحثہ اسی باہمی محبت کا آئینہ دار ہے۔

ان مذکورہ بالا ائمہ کے فقہی مذاہب کے ناپید ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں:

اوّل تو یہ کہ ان میں سے اکثر ائمہ ایسے شہروں میں مقیم نہیں تھے جہاں لوگ

۱۔ اس کتاب کا نام ہے ''اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ (مترجم)

۲۔ یہ خط امام ابن قیمؒ کی ''اعلام الموقعین'' میں موجود ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ (مترجم)

حصولِ علم کے لئے آتے ہوں اور تلامذہ کا تانتا بندھا رہتا ہو۔ مثلاً امام اوزاعیؒ کے عہد میں دمشق علمی مرکز نہیں رہا تھا بلکہ علم وہاں سے اُٹھ کر مدینہ اور بغداد چلا گیا تھا۔ اسی طرح امام لیثؒ کے زمانے کا مصر علم اور علماء کی آماجگاہ نہیں تھا۔ وہاں صرف امام مالکؒ کے تلامذہ تھے جو امام لیثؒ کے شاگردوں سے مقابلہ و مناظرہ کرتے رہتے تھے۔ بالآخر یہی مالکی اُن پر غالب آگئے۔

دوسرا سبب ان کے ناپید ہونے کا یہ ہوا کہ ان کے شاگرد اتنے قوی اور باصلاحیت نہیں تھے کہ وہ ان کی آراء و فتاویٰ کو مختلف ممالک میں پھیلاتے اور ان کے مذہب کا پرچار کرتے، یا ان کی آراء واجتہادات کو جمع کر کے کتابی شکل میں مدوّن کرتے، ان کی چھان پھٹک کرتے اور آگے اپنے شاگردوں کو ان کے مسائل سکھاتے اور لوگوں کے لئے اس مذہب کا سیکھنا اور حاصل کرنا آسان بناتے۔ اس کے علاوہ ان کی پشت پر کوئی سیاسی قوت بھی نہیں تھی جو اُن کے مذہب کی حامی اور مددگار بنتی۔

.....

ان سب مذاہب میں سے آٹھ مشہور مذاہب ایسے تھے جو تاریخ کی خطرناک موجوں سے محفوظ رہے۔ ان کے مسائل اور فتاویٰ جمع کر کے یکجا مدوّن کئے گئے، اور جہاں جہاں یہ مذاہب پھیلے وہاں کے طلبہ و علماء نے ان کی کتابوں کے درس قائم کئے۔ بعض جگہ جہاں ان کے پیروؤں کی تعداد زیادہ ہوتی، اسی لحاظ سے ان کے حلقہ ہائے درس اور مراکزِ تحقیق بھی وہاں زیادہ ہوتے۔ ان میں سے بعض مذاہب ایک سے زائد ملکوں میں پھیلے۔ اور جو مذہب جس ملک میں رائج و مقبول ہوا وہ ساتھ ہی وہاں کے رسوم ورواج اور عرف وعادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن یہ اثر پذیری صرف ان مسائل میں ہوتی تھی جو نص سے ثابت نہیں ہوتے تھے۔ (بلکہ مستنبط اور مستخرج ہوتے تھے) جیسا کہ ہم حنفی مذہب میں دیکھتے ہیں کہ ارضِ روم (ترکی) اور ماوراء النہر اور عراقین کی حنفی فقہوں میں عادات اور عُرف کا اختلاف ہے۔ اس کو فقہ کا اختلاف نہیں کہیں گے بلکہ عُرف وعادات کا اختلاف کہیں گے۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ مالکی مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ اس مذہب کے

مغرب (شمالی افریقہ) میں رہنے والے مقلدین اور عراق میں بسنے والے متبعین کے مابین بھی اسی قسم کا فروعی اور جزئی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال حنبلی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے کہ خراسان کے حنابلہ اور عراق کے حنابلہ کے مابین بھی اختلاف کی یہی نوعیت ہے۔

الغرض یہ مذاہب گویا دریاؤں کی طرح ایک قطار میں متوازی چل رہے ہیں۔ جو جس زمین پر چل رہا ہے اسی کی مٹی کا رنگ اس کے پانی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

وہ آٹھ مذاہب جن کا حال تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

حنفی مذہب، مالکی مذہب، شافعی مذہب اور حنبلی مذہب۔ یہ چاروں مذاہب اکثر اسلامی ملکوں میں پھیل گئے ہیں اور سنی مسلمانوں کی اکثریت انہی چار مذاہب کی پیرو ہے۔

اِن چار (سنی) مذاہبِ فقہ کے علاوہ چار مذاہب اور ہیں جن سے اسلامی دنیا خالی نہیں ہے۔ اِن مذاہب کے ماننے والے مختلف اقالیم اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ اکثر ممالک میں یہ اقلیت کی صورت میں بستے ہیں۔

ان مذکورہ مذاہب میں سے ایک امام زید بن علی زین العابدین (متوفی ۱۲۲ھ) کا ہے (جو زیدیہ کہلاتا ہے) آلِ بیت کے مذاہب میں سے یہ مذہب سنی مذاہب اربعہ سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ بلکہ اس حد تک قریب ہے کہ اِس مذہب کے صاحب تخریج مجتہدین کو جب امام زید سے منقول کوئی نص نہیں ملتی تو وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد کو اختیار کرتے ہیں۔ اس مذہب کے متبعین یمن اور خراسان میں پائے جاتے ہیں۔

ان میں سے دوسرا مذہب امام ابو عبداللہ جعفر صادق بن محمد باقر کا ہے۔ ان کا انتقال ۱۴۸ھ میں ہوا۔ اور ان سے امام ابو حنیفہؒ نے استفادہ کیا اور احادیث روایت کیں۔ اگر آپ چاہیں تو اس سلسلے میں امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار اور امام محمدؒ کی کتاب الآثار دیکھیں۔ ان دونوں کتابوں میں آپ کو امام ابو حنیفہؒ کی امام جعفر صادق سے مروی روایات ملیں گی۔ ان کے بارے میں خود امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ "میں نے لوگوں کے (فقہی) اختلافات کو جعفر بن محمدؒ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں دیکھا۔" ان کا مذہب عراق و ایران کے شیعہ حضرات میں مقبول ہے اور انڈونیشیا، پاکستان اور ہندوستان کے شیعہ حضرات کا بھی یہی فقہی مسلک ہے۔

ان میں سے تیسرا مذہب امام داؤد ظاہری کا ہے جو امام شافعیؒ کے شاگرد تھے۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے فقہی اجتہاد واستنباط کو صرف نصوص تک محدود رکھا اور اس کی بنیاد صرف قرآن و سنت کو قرار دیا۔ (قیاس اور مصالح مرسلہ وغیرہ کو ترک کر دیا)۔ ان کے مذہب (ظاہری) کو ان کے بعد امام ابن حزم (اندلسی) نے مدوّن کیا، اور انہوں نے نص سے تمسک کرنے میں (اپنے پیشوا) داؤد سے بھی زیادہ سختی کا مظاہرہ کیا، اور اس سلسلے میں اپنی مشہور کتاب "المحلّی" لکھی۔ اگرچہ معلوم نہیں کہ اندلس میں موحدین کے دورِ حکومت کے بعد کسی نے اس کتاب پر عمل کیا یا نہیں، لیکن یہ فقہ اسلامی کی بڑی جامع کتاب ہے، بلکہ اسلامی قانون اور اس کے مسائل کا ایک "دیوان" ہے جیسا کہ وہ خود اس کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔

ان میں سے چوتھا مذہب اباضیہ ہے جو عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے۔ یہ مذہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مبنی ہے اور اہلِ سنّت کے مذہب سے اس کا اختلاف صرف فروعات میں ہے۔(۱)

اسلامی تاریخ میں مذکور ہے کہ عبداللہ بن اباض اس خارجی فرقہ کے امام ہیں جو

۱۔ یہ مذہب عبداللہ بن اباض المری التمیمی (متوفی ۸۶ھ - ۷۰۵ء) کی طرف منسوب ہے۔ اباضیوں نے امویوں کے خلاف کئی بار علم بغاوت بلند کیا۔ بالآخر ۷۴۷ء میں یمن اور حضر موت پر اپنا تسلط قائم کیا۔ پھر ۷۵۱ء میں عمان میں عباسی خلیفہ اوّل السفاح کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ ان کا مذہب قبائلِ بربر میں خوب پھیلا بلکہ وہاں ان کے سردار عبدالرحمٰن بن رستم نے ۱۴۴ھ۔ ۷۶۱ء میں اپنی حکومت بھی قائم کرلی جو دولتِ رسمیہ کہلائی اور ۱۵۲ سال قائم رہی۔ اس کا دارالحکومت تاہرت تھا۔ اور اس کے دائرۂ اقتدار میں موجودہ الجزائر کا بیشتر حصہ، دُہران، جبالِ اوراس، تونس کا جنوبی نصف حصہ اور لیبیا کا بیشتر علاقہ شامل تھا۔ بالآخر ۲۹۶ھ۔ ۹۰۸ء میں شیعہ فاطمی خلافت کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ خوارج کا سب سے اعتدال پسند فرقہ شمار ہوتا ہے۔ آج کل اس مذہب کے متبعین شمالی افریقہ کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، خصوصاً لیبیا، الجزائر اور تونس میں۔ اس کے علاوہ یہ زنجبار میں بھی آباد ہیں اور عمان میں تو ان کی اکثریت ہے جہاں ان کی امامت وسیادت اب بھی قائم ہے۔ (معراج محمد)

عامۃ المسلمین کی تکفیر نہیں کرتے۔ یعنی مسلمانوں کی جن خطاؤں اور غلطیوں کا ذکر کرتے ہیں ان کی وجہ سے ان کو کافر قرار نہیں دیتے، بلکہ کہتے ہیں کہ وہ (ان غلطیوں کی وجہ سے) کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یعنی کافر نعمت ہیں۔

لیکن ان کے متبعین جو بعض جزیروں اور نخلستانوں (واحات (۱)) میں رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ تابعی تھے اور خارجی ہرگز نہیں تھے۔ بہرحال تاریخی حیثیت سے وہ کچھ بھی ہوں، یہ حقیقت ہے کہ ان کا (فقہی) مذہب ایک مدوّن شکل میں موجود ہے اور (مسائل و فروعات سے) مالامال ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصر کے قانونِ میراث مجریہ ۱۹۴۳ء کی دفعہ نمبر ۷۷ میں دیگر مذاہب کے علاوہ اس مذہب (اباضیہ) سے بھی قانون اخذ کیا گیا ہے۔ اگرچہ تھوڑا ہی کیا گیا ہے۔

ائمۂ اربعہ

ان ائمۂ مذاہب اربعہ کے مناقب پر ان کے متبعین نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان ائمہ اربعہ کے علاوہ جن ائمہ کا ہم نے ان سے پہلے ذکر کیا ہے، ان میں سے بھی ہر ایک کے مناقب و فضائل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ سب ذخیرہ ان کے مختلف حالات معلوم کرنے کا تو بے شک ایک اچھا ذریعہ ہے، لیکن یہ ان کی سوانح عمری مسلسل تاریخ وار پیش نہیں کرتا اور نہ ان کی زندگی کے مختلف ادوار سے بحث کرتا ہے، نہ ان کی پوری تعلیمات و نظریات کا جائزہ لیتا ہے اور نہ ان کے مذہب کے پھیلنے کا حال بیان کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مناقب میں مسلّمہ حقائق کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی مبالغہ آرائیاں بھی خلط ملط ہوگئی ہیں، جیسا کہ آپ امام رازی کی کتاب "مناقب امام شافعیؒ" اور کُردری مکّی کی کتاب "مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہؒ" وغیرہ میں دیکھیں گے۔ مزید یہ کہ کتب مناقب دراصل بکھری ہوئی معلومات کا مجموعہ ہیں جس کو نئے سرے سے علمی طریقہ پر مختلف عنوانات کے تحت مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ الواحات۔ (واحد: واحۃ) کے لغوی معنی نخلستان ہیں اور یہ عرب دنیا میں کئی علاقوں کا نام بھی ہے۔ لیکن یہاں صحرائے اعظم کے واحات (نخلستان) مراد ہیں ۱۲ مترجم۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان تحریروں میں کسی واقعہ یا امر کے اسباب و علل سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ ان کتابوں میں ایسا دقیق علمی تجزیہ اور تحقیقی بحث مفقود ہے جس کے ذریعے قاری ان بیان کردہ حالات کو اِس زمانے پر منطبق کر سکے۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ آپ جب ان مناقب کا مطالعہ کریں گے تو محسوس ہوگا کہ ان ائمہ کرام نے جو کچھ علمی گفتگو کی ہے اور مسائل بیان کئے ہیں، ان کا کوئی ظاہری سبب نہیں تھا، بلکہ وہ ائمہ نے صرف اپنے دل کی تسلی کے لئے (فرضی طور پر) بیان کئے ہیں، گویا وہ ایک علم لدنی کا اظہار ہے (فرضی طور پر) بیان کئے ہیں، گویا وہ ایک علم لدنی کا اظہار ہے (اس وقت کے معاشرہ کے مسائل کے جواب میں بیان نہیں کئے گئے ہیں)۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ گزشتہ صدی میں علمی دنیا میں ائمہ کرام کی تاریخ اور ان کی سوانح عمری سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے لیکن اب جو کتابیں اس موضوع پر لکھی جارہی ہیں ان میں علمی اور تحقیقی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو ہر واقعہ کے اسباب و علل سے بحث کرتا ہے اور اس کے جو اثرات معاشرہ پر مترتب ہوتے ہیں ان کا بھی جائزہ لیتا ہے۔

اس علمی انداز میں لکھی گئی پہلی کتاب جو میری نظر سے گزری وہ علامہ احمد تیمورؒ کی "المذاہب الفقہیۃ الاربعۃ" ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کتاب پر تبصرہ کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس کے لائق مصنف کے بارے میں اپنی یادداشتیں بیان کریں۔

علاّمہ احمد تیمورؒ

ہمارے طالب علمی کے زمانے میں دو عظیم علماء کے نام علمی مجالس میں اکثر لئے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تو ایسے تھے جن سے ہماری ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ان کے دیکھنے کو ہم ترستے تھے۔ یہ تھے "علامہ احمد تیمور" اور دوسرے صاحب بے شک بعض علمی مجالس میں نظر آجاتے تھے، اور ان کے مضامین بھی رسالوں اور مجلّوں میں پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ یہ تھے علامہ مرحوم "احمد زکی"۔

جس زمانے میں ہم قضائے شرعی کے مدرسہ میں تاریخ کا درس لے رہے تھے اس

وقت جب بھی ہمیں کسی تاریخی شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مشکل پیش آتی اور ہمارے محقق استاد بھی اس سلسلے میں دقت محسوس کرتے تو ہم یہ تجویز پیش کرتے کہ اس کے بارے میں کسی مجلّہ کے ذریعے علامہ احمد زکی صاحب سے سوال کیا جائے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ فوراً اس سوال کا جواب دیتے۔ گویا وہ اس کے لئے ایسے تیار بیٹھے ہوں جیسے ایک سپاہی جنگ کے لئے بس نقارہ بجنے کا منتظر رہتا ہے۔

دوسری جانب علاّمہ "احمد تیمور" کا یہ حال تھا کہ جب ہم بالاصرار ان سے کوئی علمی بات پوچھتے تو بے شک وہ اس کا جواب دینے پر خوشی سے آمادہ ہو جاتے، لیکن جہاں تک منظر عام پر آنے کا تعلق ہے تو وہ صرف انہی مخصوص علمی مجالس میں نظر آتے تھے جن میں بلند پایہ علماء شریک ہوں، طلبہ موجود نہ ہوں، خواہ وہ طلبہ کتنے ہی فاضل اور ماہر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم جیسے طلبہ میں ان کا نام بڑی قدر و منزلت سے لیا جاتا تھا۔ ان کی لائبریری اور اس میں موجود نادر کتب و مخطوطات کا ذکر ہوتا تھا۔ ان کی اسلامی علوم سے واقفیت اور علماء کرام سے ان کے گہرے روابط و تعلقات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ نیز علماء سے ان کے علمی مذاکرات، اور علومِ اسلامی کے لئے ان کے ایثار و قربانی اور علمی خزانوں کے حصول کے لئے ان کے بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کا چرچا ہوتا تھا۔ انہوں نے جس طرح کوشش اور محنت کر کے ان علمی خزانوں کو، خواہ وہ قلمی مخطوطات کی صورت میں ہوں یا مطبوعہ شکل میں، ہر جگہ سے حاصل کیا۔ اعلیٰ سرکاری مناصب کو ترک کیا تاکہ اسلامی علوم کے لئے اپنے آپ کو فارغ کر سکیں، اور ان علوم کے احیاء اور لوگوں میں ان کی اشاعت کے لئے پر سکون عالمانہ انداز اور بااعتماد طریقہ پر کوشش اور جدوجہد کی، ان سب باتوں کا ہر شخص کی زبان پر چرچا تھا۔

علامہ مرحوم نے اپنے علم کی تکمیل کی ابتداء اکابر علماء کی مدد سے کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے شیخ حسن طویل جیسے مفکر و زاہد اور اعلیٰ پایہ کے علماء کا تعاون حاصل کیا۔ اپنی جاگیر اور باغات کا ایک حصہ اپنے شیخ کے لئے مخصوص کر دیا، یہاں وہ ہر ہفتہ اکٹھے بیٹھتے۔ علمی الجھنوں اور مشکلات پر باہم مذاکرہ کرتے، منطق اور اصول کی گتھیوں کو سلجھاتے، عقلی و نقلی دلائل سے بحث کرتے۔

انہوں نے شیخ محمد عبدہٗ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اپنے گھر کو ان کے تلامذہ کی باہمی ملاقات کا مرکز بنایا۔ شیخ محمد عبدہٗ بھی اپنے ان تلامذہ کے درس و تدریس کے معاملہ میں بڑے دریادل تھے۔ وہ ان کو ان تمام علوم کا درس دیتے جن سے انہوں نے جامعہ ازہر میں حق کی روشنی پھیلائی اور طلبہ کو صحیح اسلامی زندگی کی راہیں دکھائیں۔

علامہ احمد تیمور کی زندگی ایک روشن نور سے عبارت تھی، وہ ایک فیضِ جاری کی طرح تھے۔ اہل علم حضرات اُن سے متعارف اور ان کے گرویدہ تھے۔ لیکن ان کے قریبی دوست صرف خواص علماء ہی ہوپاتے تھے۔

علاّمہ احمد تیمور کی وفات :

یہ پُرسکون شخصیت اسلامی علوم کے خزانوں کے مطالعہ اور ان کے حصول و انکشاف میں اسی طرح انتھک طریقہ پر مستقل مزاجی سے مشغول رہی۔ یہ بغیر کسی شور و شغب اور دھوم دھام کے خاموشی کے ساتھ تحقیقی کام کرتی رہی، بالآخر ۱۹۳۰ء کے موسم گرما کے اوائل میں

(علم کی) یہ روشن شمع بجھ گئی۔ جب بین کرنے والوں کی آوازیں گونجیں (اور تعزیتی بیانات شائع ہوئے) تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اسلام کی جس عظیم شخصیت سے وہ محروم ہوئے ہیں اس کا کیسا مقام تھا۔

میں اس زمانے میں اپنے چند بزرگ شیوخ و اساتذہ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان حضرات کی علاّمہ مرحوم سے دوستی تھی اور وہ ان سے اکثر تبادلۂ خیال بھی کیا کرتے تھے۔ میرا معمول ہوگیا تھا کہ میں ان معزّز اصحاب کی مجلس سے استفادہ کرتا اور ان کی باتوں کو سن کر اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا۔ ان حضرات کی محفل روزانہ منعقد ہوتی تھی، جس میں یہ مختلف موضوعات پر علمی گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ کوئی لگی بندھی گفتگو نہیں ہوتی تھی کہ کسی ایک فن یا موضوع تک محدود رہے، بلکہ یہ ایک قسم کی غیر رسمی دوستانہ نشست ہوتی تھی جس میں بے تکلفانہ انداز میں مختلف ادبی اور دینی موضوعات پر ہم خیال احباب اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اس

میں ادبی چٹکلے بھی ہوتے تھے، اور اسلامی مسائل پر علمی بحث بھی، نیز علمی رسائل و جرائد میں جدید مصنفین کے جو مقالات و مضامین شائع ہوتے تھے ان پر تنقید و تبصرہ بھی خصوصاً ان جدید مقالہ نگاروں کے ادبی تسامحات اور علمی لغزشوں پر خوب لے دے ہوتی تھی۔

لیکن جس روز علامہ احمد تیمور مرحوم کا جنازہ اٹھا، اُس شام کو اس مبارک محفل کا موضوع صرف آپ کی شخصیت تھی۔ اس محفل کے بعض شرکاء تو ان کے ہمسایہ تھے، اور بعض ان کے قریبی دوست تھے اور بعض وہ حضرات بھی تھے جو ان سے علمی استفادہ کرتے تھے اور مشکل مسائل کی بابت ان سے استفسار کیا کرتے تھے، ہم سب اہل محفل برابر تین رات تک انہی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، کسی اور موضوع کو چھیڑا ہی نہیں گیا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان ہی کا ذکر آجاتا تھا کیونکہ وہ بُھلائے نہیں بھولتے تھے۔

ہم عصر شخصیات کے بارے میں علامہ احمد تیمور کے مقالات ایک ادبی مجلّہ میں مسلسل شائع ہوتے تھے۔ میں جب اُن کو پڑھتا تھا تو ان کی تحریر کی بہت سی خوبیاں اجاگر ہوتی تھیں، مثلاً سچے واقعات بیان کرنا، ان کی باریکیاں واضح کرنا، ہر واقعہ کی سند کا ذکر کرنا، الفاظ ایسے واضح اور نپے تلے جو سہل ممتنع کہلائیں، عبارت ایسی آسان کہ عوام النّاس کی ذہنی سطح سے بالا نہ ہو، اور نہ ایسی گری ہوئی کہ خواص کے کانوں کو بُری لگے۔ مضمون ایسا جامع کہ پڑھنے والا اُس شخصیت کے عہد کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے تصویر کی طرح دیکھ لے۔ اُس عہد کے پس منظر میں اس شخصیت کے پورے خدوخال اور اس کے فکری سفر کی پوری کہانی تمام تفصیلات اور باریکیوں کے ساتھ واضح طور پر سامنے آجاتی تھی۔

درحقیقت علامہ احمد تیمور نے مختلف علمی جرائد و کتب میں اپنی یہ تحریریں شائع کرکے ان علمی شخصیات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا اور ان کو وہ حق دیا جس کے وہ حقدار تھے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر علّامہ احمد تیمور قلم نہ اٹھاتے تو امام حسونہ نواوی کے حالاتِ زندگی سے کون واقف ہوتا؟ تاریخ نے اب اس عظیم شخصیت کے ایسے کارنامے اپنے صفحات میں محفوظ کرلئے ہیں جو علمی خدمات کا درخشاں باب ہیں۔

میں پھر پوچھتا ہوں کہ اگر علّامہ احمد تیمور کی تحریریں نہ ہوتیں تو ایک ایسے عالم کو

کون جانتا جس کو عزت و منزلت صرف اس کے علم نے بخشی اور چار دانگِ عالم سے لوگ اس سے ملنے کے لئے صرف اس کے علم کی وجہ سے آتے تھے۔ یہ تھے امام حسن الطویل۔

ہمارے وہ علماء اور شیوخ جن کے مرتبہ کی بلندی کا مدار علم اور صرف علم ہے، عوام الناس میں ان کو وہ شہرت نہیں ملتی جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، یہ صرف علامہ احمد تیورؒ کی علم اور اہلِ علم سے وفا اور قدردانی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ایسی علمی شخصیات کے تذکرہ کو کتابوں اور رسالوں میں شائع کر کے دوام بخشا۔

جو لوگ علامہ احمد تیمور سے پہلے وفات پاگئے اور ان کی علامہ سے ملاقات بھی ہوئی وہ تو بڑے خوش نصیب نکلے (کہ انہیں علامہ مرحوم جیسا تذکرہ نویس مل گیا) لیکن جو لوگ اُن کے بعد آئے وہ بیچارے ایسے انصاف پسند تذکرہ نویس سے محروم ہیں جو ان کے علم و فضل کی صحیح قدردانی کر سکے اور ان کی علمی و دینی خدمات کا تذکرہ کتب و رسائل میں شائع کر سکے۔ جبکہ صورتِ حال اس یہ ہے کہ ان سے علم و فضل میں فروتر اور نالائق لوگوں کا شہرہ عام ہے جن کی نہ کوئی دینی خدمات ہیں اور نہ علمی اور معاشرتی کارنامے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب کوئی منصف محقق ہے، جو علم و فضل کے اصل حاملین کو ان کا حق دے سکے اور لوگوں میں ان کو متعارف کرا سکے جیسا کہ علامہ احمد تیمور مرحوم نے ان کے برگزیدہ اسلاف کے ساتھ انصاف کیا اور ان کی قدردانی کا حق ادا کیا۔

یہاں یہ بات عرض کر دوں کہ جن بزرگ علماء کی زندگی میں ہم ان سے ملے ہیں اور ان کے علوم و معارف سے سیراب ہوئے ہیں اور جنہوں نے ہمارے علوم و افکار کو صاف ستھرا رکھنے میں اور ہر قسم کے شکوک و اوہام اور انحراف سے محفوظ رکھنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ ہماری تاریخ کی امانت ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کا تذکرہ عام کرنا ہم پر فرض ہے۔

جاری ہے